Article

Saqi Farooqi's Poem:Intellectual and Technical Aspects

ساقی فاروقی کی نظم: فکری وفنی جہات

Dr. Tariq Hashmi*[1]
Principal College of Oriental Languages
Government College University, Faisalabad
Dr Mohammad Kioumarsi*[2]
Associate Professor, Faculty of Literature and Human Sciences
University of Tehran, Iran

.1 **ڈاکٹر طارق ہاشمی**

پرنسپل کالج آف اورینٹل لینگو ئجز، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

.2 **ڈاکٹر محمد کیومرثی**

ایسوسی ایٹ پروفیسر، فیکلٹی آف لٹریچر اینڈ ہیومن سائنسز، تہران یونیورسٹی، ایران

Correspondanance: drtariqhashmi@gcuf.edu.pk

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 25-10-2024
Accepted:22-12-2024
Online:25-12-2024

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: Saqi Farooqi is one of those poetic voices of Urdu whose poems are unique both in terms of subject and style. He is counted among those poets of the twentieth century who did not shun tradition in the desire to be innovative, but continued on their creative journey with the healthy attitude of the classical tradition. Where the political and country conditions affect the life of a common man, the poet is also affected by contemporary conditions and events unlike other people. Saqi accepted influences from contemporary national and international events, which resulted in his comprehensive poetic thought.

The characteristic of Saqi Farooqui's poem is that it explores the complexities of human relationships.He has the ability to blend

traditional lyrical genres with contemporary sensibilities. Inspired by classical Urdu poets, infusing his work with modern themes and perspectives, he creates a unique poetic landscape. His poems are musical and resonate for a long time on the screen of the mind. Through his intellectual output he tackles existential questions.

KEYWORDS: Saqi Farooqi, Modern Urdu Poem. Classical tradition, Symbols, Animal, Poetic landscape

جدید اُردو نظم کے منظر نامے پر بعض ایسی تخلیقی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں جو ترقی پسند نظریے کے تسلسل کو بر قرار رکھے ہوئے ہیں لیکن ادبی سطح پر اُن کا شعری اظہار ابلاغ کے اُن تقاضوں کو قابلِ توجہ نہیں سمجھتا جو ترقی پسند اہلِ دانش نے شاعروں اور ادیبوں سے کیے۔ یہ شعراء ابلاغ کو اہم ضرور خیال کرتے ہیں لیکن قاری سے بقول اختر حسین جعفری "اُس طلسم پس نگاہ" کے ادراک کا تقاضا بھی کرتے ہیں جو ایک شاعر سے شعر کہلواتا ہے۔ مذکورہ توانا تخلیقی آوازوں میں بہت اہم نام اختر حسین جعفری، ساقی فاروقی اور آفتاب اقبال شمیم کے ہیں۔

ساقی فاروقی کا شمار اُردو کی اُن شعری آوازوں میں ہوتا ہے جن کی نظم اپنے موضوع اور اُسلوب دونوں اعتبار سے منفرد ہے۔ اُن کا شمار بیسویں صدی کے اُن شعراء میں کیا جاتا ہے وہ لوگ جنھوں نے جدت کے شوق میں روایت کو ترک نہیں کیا بلکہ کلاسیکی روایت کے صحت مند پہلوؤں کو اپنے ساتھ رکھتے ہوئے تخلیقی سفر جاری رکھا۔ سیاسی و ملکی حالات جہاں ایک عام آدمی کی زندگی کو متاثر کرتے ہیں وہیں شاعر پر بھی معاصر حالات و واقعات دوسرے لوگوں کے بر عکس زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ ساقی نے معاصر قومی و بین الاقوامی واقعات سے اثرات قبول کیے جس کے نتیجے میں اُن کی ہمہ جہت شاعرانہ فکر وجود میں آئی۔

ساقی فاروقی کی شاعری میں خوف اور انتشار کی کیفیت ملتی ہے۔ ساقی احساس، لفظ اور خیال کے کلیشے کے خلاف ہیں۔ زندگی کے تجربات کی کشمکش میں فاروقی کو اپنی شاعری کے لیے تحریک ملی اُن کی شاعری زبان اور ثقافت کی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے محبت، آرزو، اُمید، ذاتی تجربات اور آفاقی سچائیوں سے لبریز نظر آتی ہے۔ اپنے منفرد طرزِ اظہار اور جدید حسیت کی وجہ سے ہم عصر شاعروں میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ اُن کی نظموں میں حشرات، حیوانات، نباتات اور مختلف قسم کی پیشوں کا تذکرہ شد و مد سے ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری خاص طور پر نظم میں نئے استعارات و تشبیہات اور علامتوں کو بر تا ہے جنسی استعاروں کے بے دریغ استعمال سے انھوں نے اپنے موضوعات کو پُر لطف بنانے کا کام لیا ہے۔

ساقی فاروقی نے اپنی نظموں میں شاعری کی تیسری جہت کردار نگاری کو خصوصی اعتبار سے برتا ہے۔ "خالی بورے میں زخمی بِلا" ، "شیر امداد علی کا مینڈک"، "حمل سرا"، "الکبڑے"، "شاہ دولے کا چوہا"، "شہباز بانو دختر شہباز حسین"، "حاجی بھائی پانی والا"، "مستانہ ہجڑا"، "صدمہ"، "سسٹر ماریہ تیریزا"، "شاہ صاحب اینڈ سنز"، "جاوید کی خاموشی" اور دیگر کئی نظموں میں اپنے اچھوتے اور منفرد کرداروں کے ذریعے ایک نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔ اِن نظموں میں مکالماتی رنگ اور بسا اوقات خود کلامی کا سا انداز نظر آتا ہے۔ نظم "شاہ صاحب اینڈ سنز" میں شاہ صاحب کا کردار ہمارے ماحول میں مجبور محض فرد کی ایک اندوہ ناک تصویر پیش کرتا ہے۔ جنہوں نے ساری زندگی دکھ اور بے چارگی میں گزاری یہاں تک کہ نان شبینہ کی ڈور میں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ اور حیات کی تمام رونقوں کا پردہ پڑ گیا۔ شاہ صاحب نے زندگی کے دکھ خود سہے مگر اب ان دکھوں کو آئندہ نسل میں منتقل کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے چنانچہ:

اپنے بیٹوں کو کلیجے سے لگایا
جی بھرا تھا، ابر کے مانند روئے
رو چکے تو ایک مہلک آتشیں تیزاب کے
شعلۂ سفاک سے
ان کی فاقہ سنج آنکھوں کو جلایا
اور سجدے میں گرے
جیسے گہری نیند میں ہوں
جیسے اک سکتے میں ہوں۔۔۔
مدتوں سے ان بیاباں راستوں پر
چار اندھے دوستوں کا ایک کورس گونجتا ہے
"اے سخی! شہر سخاوت میں گزر اوقات کر
اے نظر والے! نظر خیرات کر

شاہ صاحب کا یہ کردار یوسف ظفر کے ہاں اس باپ کے کردار سے کہیں تلخ تر ہے جو "تقلید ابراہیم" کرتے ہوئے اپنے معصوم کے ریشمی حلقوم پر خنجر چلا دیتا ہے۔ یہ تلخی، ساقی کے کردار "الکبڑے" میں فزوں تر ہو جاتی ہے جب یہی تجربہ ایک اور انداز سے دہرایا جاتا ہے۔ ساقی فاروقی اس نظم میں ایک باپ کو اپنی ننھی سی بیٹی کا بازو توڑ کر اسے خاندانی پیشے کا "منافع بخش ذریعہ" بناتے ہوئے دکھاتے ہیں اس طرح وہ الکبڑے کی آپ بیتی کو جگ بیتی کا روپ دے دیتے ہیں۔

اس پس منظر میں

باپ کی مستقبل اندیشی نے
تین برس کی
لنج منج سی
چیز کے دونوں ہات
چٹ پٹ توڑ کے
ایک ایک کہنی اور بنادی تھی
چار دانگ میں شہرت پھیل گئی
"پر دا۔۔۔۔۔
۔۔۔۔پر دا
چار کہنیوں والے
رام چرن الکبڑے آتے ہیں

نظم "شاہ دولہ کا چوہا" معاشرتی جبر اور سماجی بے حسی کو بے نقاب کرتی ہے۔ نظم کا مرکزی کردار ایک فقیر ہے جو اپنے پیشے سے تھک ہار کر خانقاہ کا رُخ کرتا ہے کہ وہاں سے کسی اپاہج بچے کو خرید کر اُس سے یہ بیگار لیا جائے نظم کے آخری بند میں بے زبان معصوم قیدی بچے کی انسانیت سوز تصویر پیش کرتے ہیں:

دیدوں پہ پٹی ہے
ہونٹوں پہ ٹانکے ہیں
گردن میں پٹا ہے
پٹے میں چمڑے کا
چوڑا سا تسمہ پڑا ہے۔۔۔
رضا کار چوہے نے
بلے کو میرے حوالے کیا
اور چپ چاپ آگے روانہ ہوا
اُس کی جلتی ہوئی منتقم آنکھوں میں
صدیوں کے سوگ
جگر جگر مسکرا رہے تھے

اس نظم کے ذریعے ساقی فاروقی نے سماجی بدعقیدگی پر کاری ضرب لگائی ہے۔ ہمارے معاشرے میں مسلمان بے اولاد جوڑے مَنّت کی ادائیگی کے طور پر پہلی پیدا ہونے والی اولاد کو گجرات میں قائم شاہ دولہ کے مزار پر دان دیتے ہیں۔ وہاں ان بچوں کے سر کو لوہے کی مضبوط ٹوپی میں مقید کر دیا جاتا ہے۔ جس سے بچے کے سر کی بڑھوتری نہیں ہوتی۔ بعد میں ان بچوں سے بھیک منگوانے کے ساتھ ساتھ دوسرے بہت سے غیر قانون کام کروائے جاتے ہیں۔ ساقی فاروقی نے اس نظم میں اس فرسودہ روایت کو بے نقاب کرتے ہوئے معاشرتی جبر کے خلاف آواز اُٹھائی ہے۔

ساقی فاروقی کا ایک اور اہم نظمیہ کردار شیر امداد علی کا ہے جس کی علامتی سطح پر مختلف توضیحات پیش کی جاسکتی ہیں۔ تاہم سماجی تناظر میں دیکھیں تو یہ بھی شاہ صاحب اور الکبڑے اور جاوید ہی کا تسلسل معلوم ہوتا ہے۔ شیر امداد پانی کے تالاب میں کنول کے پھول تک رسائی کی کوشش میں اترے تھے مگر مینڈک ایک بچہ ان کے منہ میں چلا گیا جو زندگی بھر کا روگ بن گیا۔ "کنول کا پھول" اس نظم میں حصولِ زر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جب کہ "مینڈک کا بچہ" حرص و ہوس میں لتھرے ہوئے انسان کی کمائی ہوئی دولت ہے جس کے لیے وہ ہر طرح کے ناجائز ذرائع استعمال کرتا ہے۔ کنول کے پھول کے حصول کی خواہش انسان کو ایک ایسے ابتلا میں ڈال دیتی ہے کہ علاج ممکن نہیں رہتا۔

جدید نظم میں حیواناتی علامات و تماثیل کو خصوصی اعتبار سے برتا گیا ہے۔ ساقی فاروقی اس حوالے سے رجحان ساز شاعر قرار دیے جاسکتے ہیں انھوں نے کئی ایک نظموں میں حیوانات کو وسیع تر تناظر میں سماجی و سیاسی مسائل کی نشاندہی کے لیے حصہ نظم بنایا ہے۔ انھوں نے جانوروں کی جبلت کو مد نظر رکھتے ہوئے بر محل اور متنوع تخلیقی تجربات کیے ہیں۔ ساقی فاروقی کی حیوانات پر مبنی نظموں میں موجودہ دور کی لرزہ خیز بے حسی، جان لیوا حرص و ہوس، اور اعصاب شکن خود غرضی پر گہری تنقید کی گئی ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کے پیچیدہ انسان کو درپیش مشکلات، مصائب، اور روزگار کی کشمکش کو الفاظ میں یوں سجایا کہ ان کی حق گوئی اور بے باکی نمایاں ہو جاتی ہے۔ ان نظموں کا طنزیہ اسلوب ان کے تنقیدی شعور کا عکاس ہے، جو ان کے منفرد اور پُر اثر ادبی اسلوب کا اہم پہلو ہے۔ ان نظموں میں "ایک کتا"، "خرگوش کی سرگزشت"، "ایک سور سے"، "امانت"، "شیر امداد علی کا مینڈک"، "خالی بورے میں زخمی بلّا"، "تتلی"، "پیراسائیٹ" اور "مکڑا" اہمیت کی حامل ہیں۔

ساقی فاروقی حیواناتی علامات اور تماثیل کے حوالے سے اپنے شعری مجموعے "حاجی بھائی پانی والا" میں افتخار عارف کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اصل میں کائنات کو میں صرف انسانوں کی جاگیر نہیں سمجھتا اور اس پر ایمان رکھتا ہوں کہ کائنات پر حیوانات، حشرات الارض اور نباتات کا اتنا ہی حق ہے جتنا ہم انسانوں کا۔۔۔ ان نظموں میں ایک فرد ان کے رشتے سے کائنات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ سیدھی سادھی "اینیمل پوئمس" نہیں ہیں۔ میرے جانور "جارج آرول" کے جانوروں کی طرح انسانی یا سماجی حیثیت نہیں رکھتے یا میں "ٹڈ ہیوز" کی

طرح ڈیٹیچ ہو کر ان کے بارے میں ان پر ترس کھا کر نہیں لکھ رہا ہوں میں تو اس کمپلیکس عہد کے کمپلیکس مسائل کے ساتھ ان کے ساتھ شامل ہوں۔"(۱)

ساقی فاروقی کی نظم "مکڑا" فکر انگیز نظم ہے۔ اس میں حیوانی تمثیل کے ذریعے شاعر نے دنیا کے فریب اور دھوکے کا پردہ فاش کیا ہے۔ نظم میں "مکڑا" مکر اور جھوٹ کی علامت ہے جو مسلسل فریب دے کر بالآخر فرار کی راہ اختیار کرتا ہے۔ شاعر نے اس دنیا کا موازنہ مکڑی سے کیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ نظم کا بیانیہ کردار وہم اور فریب کے درمیان سچائی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ مذکورہ نظم سوال کرنے، حقیقت کی جانچ اور سچ کی دریافت کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ شاعر نے دنیا کو جیل خانے سے تعبیر کیا ہے جبکہ اس میں مقید انسان کسی زینے کے متلاشی ہیں۔ شاعر کے بقول دھوکے اور فرار کا رستہ آسان جبکہ سچ کا رستہ طویل اور صبر آزما ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکڑا دھوکے سے اس قید خانے سے رہائی حاصل کر چکا ہے مگر بیانیہ کردار ابھی بھی اس آزمائش میں ثابت قدمی کے ساتھ کھڑا ہے۔ یہی ثابت قدمی اور صداقت زندگی کی اصل حقیقت ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔

جو کہیں بھاگ گیا ہے
اُسے معلوم نہیں
جیل خانے کے پرانے ٹب میں
اک زمانے سے پڑا ہوں میں بھی
کوئی پروانہ نہ اِدھر آتا ہے
نہ کوئی زینہ
کسی سمت نظر آتا ہے

ساقی فاروقی کی نظمیہ شاعری نفسیات کی گہرائی میں اترتی ہے۔ ان کی شاعری شناخت، خود آگاہی اور نفس کے مختلف پہلوؤں کے درمیان اندرونی کشمکش سے متعلق وجودی سوالات کو حل کرتی ہے۔ شاعر انسانی نفسیات، فطرت کی پیچیدگیوں اور فرد کی خواہشات اور معاشرتی توقعات کے درمیان دائمی تصادم کو تلاش کرتا ہے۔ اپنے موضوعات کو موثر طریقے سے بیان کرنے کے لیے ساقی فاروقی بھرپور علامت نگاری اور امیجری کا استعمال کرتے ہیں۔

ساقی فاروقی کی نظم "میں اور میں" شناخت کے بحران کے تصور کی گہرائی سے تحقیق کرتی ہے۔ جو قارئین کو خود پسندی کی پیچیدگیوں اور انفرادی شناخت کو تشکیل دینے والے بے شمار عوامل پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ خود شناسی اور فلسفیانہ موضوعات کے ذریعے مذکورہ نظم انسانی حالت، وجود کی دریافت اور صداقت کی ابدی جستجو کو سامنے لاتی ہے۔ اس نظم کا شعری اسلوب آلات نظم کی جمالیاتی کشش کو بڑھاتا ہے۔ جبکہ اس میں موجود فلسفیانہ گہرائی قاری کو حقیقت، شعور اور نفس کی

نوعیت کے بارے میں بنیادی سوالات پر غور کرنے پر اکساتی ہے۔ نظم "میں اور میں" خود شناسی کی دعوت دیتی ہے اور قاری کو اپنے اندرونی تضادات کا سامنا کرنے کی ترغیب دینے کے ساتھ ساتھ انسانی تجربے کی گہرائی کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ ساقی فاروقی نے اس نظم کے ہر مصرعے کو دوسرے مصرعے کے ساتھ اس طرح پیوست کر دیا ہے کہ ایک مربوط کڑی بن جاتی ہے۔ اس کڑی کے ہر مصرعے کا اختتامیہ اگلے مصرعے کا ابتدائیہ قرار پاتا ہے۔

میں ہوں میں!
وہ جس کی آنکھوں میں جیتے جاگتے درد ہیں
درد کہ جن کی ہمراہی میں وہی روشن ہے
دل جس سے میں اک دن اک عہد کیا تھا
عہد کہ دونوں ایک ہی آگ میں جلتے رہیں گے
آگ کہ جس میں جل کر، جسم ہوا خاکستر
جسم کہ جس کے کچے زخم بہت دُکھتے تھے
زخم کہ جن کا مرہم وقت کے پاس نہیں ہے
وقت کہ جس کی زد میں سارے سیارے ہیں
سیارے جو قائم ہیں اپنی کشش پر

اس نظم میں ساقی فاروقی وسیع تر ثقافتی اور سماجی فریم ورک کے اندر شناخت کے لیے فرد کی جدوجہد کو موضوع بناتے ہیں۔ نظم معاشرتی اصولوں، توقعات اور دباؤ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ذاتی خود مختاری اور بیرونی اثرات کے درمیان تناؤ کو اجاگر کرتے ہوئے، فاروقی ایک ایسے معاشرے میں الگ اور مستند شناخت قائم کرنے کے اہداف کی نشاندہی کرتے ہیں جو کسی فرد پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔ نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی تکمیل اپنی شناخت کو قبول کرنے اور اپنے آپ سے جڑے رہنے میں ہے۔

"نیاروگ" ایک فکر انگیز نظم ہے۔ جو جدیدیت، وجودی فکر اور انسان کی مختلف حالتوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ "نیاروگ" کا تنقیدی اسلوب فلسفیانہ سوالات اور سماجی رجحانات پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ نئے دور کا فرد تنہائی نا آسودگی ، بیگانگی اور مغائرت سے دوچار ہے۔ لہٰذا ہر طرح کی آسائشوں اور سہولیات سے مستفید ہونے کے باوجود وہ تشنگی محسوس کرتا ہے۔ یہی نا آسودگی، اضطراب اور عدم تکمیلیت مذکورہ نظم میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہ نظم مابعد جدید دور کے فرد کا نوحہ ہے اور آشوب بھی:

ہم سمندر میں بھی پیاسے تھے بہت

آگ دیکھی آب میں
دیر تک بہتے رہے جسموں کے شہر
روح کے سیلاب میں
دیر تک اُٹھتی رہی لذت کی لہر
رنگ کے گرداب میں
اور ہم دونوں اکیلے تھے بہت

اسی نوعیت کی ایک اور نظم "نایافت" میں متکلم کردار نہ صرف اپنی کھوج میں ہے بلکہ وہ کسی اور کی تلاش میں بھی سرگرداں ہے۔ وہ ایک ایسے اجڑے ہوئے شہر میں مقیم ہے جہاں سب کھوئے ہوئے ہیں۔ جہاں وعدوں کی کوئی حقیقت نہیں جہاں خواب ٹوٹے اور بکھرے ہوئے ہیں۔ اس نظم میں ساقی فاروقی نے موجودہ دور کے انسان کی شناخت پر سوال اُٹھایا ہے۔ وجودی کرب کی حامل یہ نظم خود کلامی کے انداز میں لکھی گئی ہے جس کا آغاز ہی استفہامیہ انداز میں ہوتا ہے:

تو کون ہے
میں کون ہوں سب لوگ ہیں
بچھڑے ہوئے
دن زہر ہیں
بے صبر ہیں سب شہر ہیں
اُجڑے ہوئے

نظم "پیراسائیٹ" فرد کی داخلی تنہائی اور ناآسودگی کے تناظر میں لکھی گئی ہے۔ تنہائی وجودی کرب کا بڑا اہم حوالہ ہے۔ پیراسائیٹ سے مراد آکاش بیل، آکاس بیل یا امر بیل ہے۔ جو ہرے بھرے درختوں کا رس چوس کر خود کو سرسبز و شاداب رکھتی ہے، خمار بھری نوخیز جوانی کی طرح لہلہاتی رہتی ہے، لیکن اسی دوران متاثرہ درخت سے اس کی ہریالی، بالیدگی، روئیدگی اور خوبصورتی چھین لیتی ہے، یہاں تک کہ اسے ویران اور دائمی مریض بنا دیتی ہے۔ شاعر نے اس کے لیے سہاگن بیل کی ترکیب استعمال کی ہے۔ نظم میں شاعر نے انسانی وجود میں یکے بعد دیگرے تبدیل ہو جانے والے موسموں کے متعلق قلم فرسائی کی ہے۔ متکلم کے بیانیے مطابق سہاگن بیل جو برسوں تک جان کا عذاب بنی رہی اب اپنے اندر کی تکلیفوں اور تلخیوں سے گھبرا کر کمھلا گئی ہے۔ اب محبت کے وجود کو پیراسائیٹ سے نجات مل چکی ہے۔

ساقی فاروقی کی نظم "جزیرہ" وجودی کرب، تنہائی اور اضطراب کی نمائندگی کرتی ہے۔ رات کی تنہائی میں ہلکورے لیتا سرخ جزیرہ خواب ناک ماحول کشید کرتا ہے اور شاعر کے جذباتی سفر کی طرف اشارہ ہے۔ سرخ جزیرہ محبت یا محبت میں ملنے

والے دکھوں کی طرف کنایہ ہے جبکہ سمندر متکلم کے جذبات کی وسعت اور گہرائی کو ظاہر کرتا ہے۔ نظم میں تکرارِ لفظی کا اہتمام کیا گیا ہے۔ نظم کے یہ مصرعے دیکھیے:

رات سمندر میں
وہ سرخ جزیرہ ہلکورے لیتا ہے
جس کے نغمے اور نوحے
مرے اندر بہتے ہیں
اول اول کے سکھ سکھ
آخر آخر تک زندہ رہتے ہیں

ساقی فاروقی کی نظموں میں وجودی فکر کا ایک اور مظہر جذبات کی برانگیختگی اور خوابوں کی شکست و ریخت ہے۔ نظم "نغمہ گروں کا نوحہ" ہستی اور نیستی، امید اور یاسیت کے مابین جذباتی ٹکراؤ کی روداد ہے۔ جس میں رجائیت اور تعمیری نقطۂ نظر کو اولیت دیتے ہوئے خواب فروشوں کے ماتم کو نژادِ نو میں منتقل ہوتے دکھایا گیا ہے۔ لیکن نئی نسل تک آتے آتے ان خوابوں کو نیا رنگ اور نیا آہنگ مل جاتا ہے۔ مذکورہ نظم میں شاعر کی گہری حساسیت اور جذباتی وابستگی واضح طور پر جھلکتی ہے۔ شاعر کے لہجے میں صداقت اور سچائی کی تڑپ نمایاں ہے، جس میں وہ یادوں اور امیدوں کا دامن تھامے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ یہ نظم نہ صرف ماضی کی تلخیوں اور موجودہ حالات کی حقیقت کو پیش کرتی ہے بلکہ تبدیلی اور شفا کے خیال کو بھی چھوتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ درد اور نقصان کے باوجود، ترقی اور تجدید کا امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے۔

جن اکھووں نے
پھوٹ پھوٹ کر
موسم کی تبدیلی کا احساس دلایا تھا
شاخ شاخ پر
عہد سبز کا نغمہ گایا تھا
تیز ہوا میں
ٹوٹ ٹوٹ کر
گرتے جاتے ہیں
جن سے دل میں
دھنک کھلی رہتی تھی

جن کی خوشبو
سانسوں میں آہستہ آہستہ بہتی تھی
وہ مولسری کے پھول بکھرتے
منظر کو آزردہ کرتے جاتے ہیں
یہ ان خواب فروشوں کا ماتم ہے
جن کے خواب ہماری آنکھوں سے چھلکیں گے
جو ہم میں ظاہر ہوں گے

ساقی فاروقی کی ایک اور نظم "بیساکھی" مختصر مگر معنی خیز نظم ہے۔ نظم میں خوف اور دہشت کے آثار واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ مذکورہ نظم میں شاعر خوابوں کی بیساکھی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ اُس کی خالی آنکھوں کو خوابوں کی اشد ضرورت ہے کیونکہ خواب ہی جینے کا سامنے مہیا کرتے ہیں۔ خواب درد کی شدت کو کم کرتے ہیں۔ اور خوف سے رہائی دلاتے ہیں۔ نظم میں شاعر نے امیج سازی کرتے ہوئے کمال فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

مری نظروں میں
آئندہ کے افسوس کے سائے لرزاں ہیں
مجھے قید خوف سے رہا کرو
میں اپنے درد کی ننگی دھوپ سے
گھنی تسلی مانگ مانگ کے ہار گیا
(اے درد میرا فیصلہ کرو)
مری خالی آنکھیں
منظر منظر بھٹک رہی
لڑکھڑا رہی ہیں
دَیا کرو
مجھے خوابوں کی بیساکھی دے دو

نظم "مردہ خانہ" کی ایک اور خصوصیت شاعرانہ تجسیم کاری بھی ہے۔ انھوں نے موت اور موت کے بعد کے مناظر کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس نظم میں ہوا کا سرد ہاتھ اور دروازے کا سر پٹکنا تجسیم کاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔

نظم "زینہ اور سایہ" مختصر مگر فکر انگیز نظم ہے۔ اس نظم میں فاروقی نے زندگی کے مختلف پہلوؤں اور انسان کی مختلف کیفیات کا اظہار ندرتِ خیال کے ساتھ کیا ہے۔ انسانی زندگی میں آنے والے دکھ اور تکلیفیں زندگی کے ہر زینے پر نت نئے انداز میں سامنے آتے ہیں۔ شاعر اپنے ساتھ کسی پرچھائی کو دیکھتا ہے۔ وہ دراصل اس کا داخلی خوف ہے۔ جس کی وجہ سے وہ سہما اور ڈرا ہوا کھڑا ہے۔ ساقی فاروقی کی شاعری میں در آنے والا خوف کے متعلق ن۔ م راشد لکھتے ہیں:

> "تمہارے پہلے مجموعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ تمہارا جذبۂ غالب خوف ہے اور اسی خوف کے باعث اپنے آپ سے عشق بھی جیسے کوئی بچی کے ڈر سے اپنے آپ ہی سے لپٹ جائے۔"(۲)

موت کی دہشت اور خوف پر مبنی نظم "محاصرہ" نہ صرف قوت سامعہ کو متاثر کرتی ہے بلکہ حسِ باصرہ کے لیے تسکین کا سامان فراہم کرتی ہے۔ نظم کے یہ چند مصرعے دیکھیے لفظ "لٹکا" کو جس طرح شاعر نے لٹکا کر (عمودی رُخ جچے کر کے زاویہ قائمہ بناتے ہوئے) لکھا ہے ایک نیا حسی تجربہ بن کر سامنے آتا ہے۔

وقت داماندہ پرندے کی طرح
ل
ٹ
ک
ا
ہوا چیختا ہے
موت اطراف و جوانب میں
کسی وحشی درندے کی طرح پھرتی ہے

ساقی فاروقی نے اپنے خیال کی ترسیل کے لیے داستان گوئی کا سہارا لیا ہے۔ داستانوی طرز اظہار نہ صرف قاری کے تجسس کو ابھارتا ہے بلکہ اُسے فن پارے کے ساتھ آخر تک جوڑے رکھتا ہے۔ وہ ایک کہانی گو کی طرح ماورائی عناصر کو اپنے نظمیہ تجربے کا حصہ بناتے ہیں۔ ساقی فاروقی نے اپنی شاعری کو جدیدیت کی رو سے نکال کر مابعد جدیدیت کے رستے پر لا کھڑا کیا ہے۔ اُن کی نظمیں مثنوی کی روایت کا تسلسل تو ہیں ہی ساتھ ہی منظوم ڈرامائی لوازمات کی بھی حامل ہیں۔ اکیسویں صدی کی حیران کن برقیاتی اور طلسماتی دنیا کو انھوں نے لفظوں میں مقید کر دیا ہے۔ وہ جوہری تابکاری، دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں اور شدت پسندی سے خائف ہیں۔ ریاستی جبر، سماجی جکڑ بندیوں، اقتصادی و معاشی عدم استحکام اور تانیثی شعور کے اظہار کے لیے وہ داستان نویسی کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ اُن کی نظمیں "پام کے پیڑ سے گفتگو"، "چراغ کی تلاش"، "گھر"، "سحر زدہ"، "شہر زینہ" اور

"سایہ" اور خاص طور پر حیوانات پر مبنی نظمیں داستانوی اسلوب کی حامل ہیں۔ نظم "چراغ کی تلاش" میں الہٰ دین اور اُس کے چراغ کو عصرِ جدید کے تناظر میں دیکھیے:

میری رگوں میں ناچ رہا تھا زہر مری محرومی کا
وقت کے بوڑھے جادوگر نے کیا جانے کیا سحر کیا
میں الہٰ دین اس کے پیچھے اک صحرا میں جا نکلا
پانچ درم کا وعدہ کر کے اس بوڑھے نے مجھ سے کہا
میری باتیں یاد رہیں اس غار کے اندر جلدی جا
میں اُس اندھے غار میں اُترا اور اترتا چلا گیا
اندر جا کر دیکھا میں نے طاق چراغ سے خالی تھا

ساقی فاروقی کی نظم "سحر زدہ شہر" میں تنہائی، ویرانی، آسیب زدگی، حرص و ہوس اور دنیاوی خداؤں کے حاکمیت پسندانہ اطوار پر لکھی گئی ہے۔ نظم میں شہر کی تباہی و بربادی کا تذکرہ ڈرامائی اور داستانوی طرز میں کیا گیا ہے۔ اقتصادی بدحالی کا بیان، امن و امان کی ناگفتہ بہ حالت اور اس کے نتیجے میں ذہنی عدم استحکام کا پیدا ہو جانا ایسے عناصر ہیں جو اس کو جدید شہر آشوب کے زمرے میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ شہر آشوب کے دائرہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ:

"جدید دور میں شہر آشوب نہیں لکھا جاتا مگر سیاسی اور اقتصادی موضوعات پر لکھی جانے والی اکثر نظمیں شہر آشوب کے ذیل میں آتی ہیں۔ تقسیم ہندوستان اور پھر سقوطِ مشرقی پاکستان کے نتیجے میں جو قتل و غارت، بے روزگاری، اقتصادی پریشانی اور انتشار و ابتری کی کیفیات پیدا ہوئیں۔ جدید شعرا نے اپنے اپنے انداز میں ان پر نظمیں لکھیں۔ اس لحاظ سے انہیں بھی شہر آشوب کا نام دیا جا سکتا ہے۔"(۳)

شہر آشوب کی نئی معنویت اور موضوعاتی تنوع کا جائزہ لیتے ہوئے نوشاد عالم لکھتے ہیں:

"بے روزگاری، اقتصادی بدحالی، اقتدار کی تبدیلی، آبادی کی کثرت، جذبہ و خلوص کی کمی، زندگی کا مشکل ترین ہونا اور اس سے بالآخر ہار جانا، عوام میں حقیقت کے شعور کا بیدار ہونا، اس کے نتیجے میں عوام میں راسخیت کی کمی کا پیدا ہونا اور عدلیہ کا جانبدارانہ رویہ وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جنھوں نے جدید شہر آشوب کو ایک نئی جہت اور نئی سمت دی ہے۔"(۴)

ساقی فاروقی نظم "سحر زدہ شہر" میں عفریت زدگی جنوں کی کارفرمائیاں، ہفت افلاک تک آنچ دیتی ہوئی زمین، سانپ جیسی زبانیں نکال کر لاشوں پر پرواز کرتی ہوئی چیلیں، بے صدا دکانیں، سر جھکائے ہوئے مکان، فراعین کے مقبرے،

تعاقب کرتی ہوئی آوازیں، اسم اعظم پڑھتی ہوئی زبانیں اور طلسمی فضا کے زیر اثر داستانوی اور اساطیری فضا کی آب یاری کرتے ہیں۔ نظم کے آخری چند مصرعے دیکھیے:

ایک آواز میرے تعاقب میں ہے
میرے پیچھے چلی آتی ہے پے بہ پے
"گھوم کر دیکھ لے گھوم کر دیکھ لے
گھوم کر دیکھ لے ورنہ پچھتائے گا
نامراد، اس طرف ایک نظر دیکھ لے"
روک اسے اے بلاؤں سے برتر خدا
اے خدا، اے خداؤں سے برتر خدا
میرے دل نے کہا! اسم اعظم پڑھو
تیز بھاگو ذرا اور تیز۔۔۔ اور تیز
آؤ جلدی کرو اس مکاں میں چلو
ورنہ پتھر میں تبدیل ہو جاؤ گے
یا خداؤں میں تحلیل ہو جاؤ گے

مابعد جدید دور کا ترقی یافتہ فرد داخلی اور قلبی اطمینان سے عاری ہے وہ اپنے آسودہ حال ماضی میں جھانکتا ہے کہ شاید ماضی ہی سے وہ خوشیاں کشید کر سکے لیکن ماضی میں جانے سے پتھر میں تبدیل ہو جانے کا امکان غالب ہے۔ شہر آشوب کی ایک مثال ساقی فاروقی کی نظم "کاسنی روشنی" قرار دی جا سکتی ہے۔ ایک کہانی گو کی طرح ساقی فاروقی نے سسکتے ہوئے شہر کی بے بسی کو نہایت مہارت کے ساتھ نظم کی واردات کا حصہ بنایا ہے۔ نظم کا متکلم کردار نیند نہ آنے کی وجہ سے شہر سے مخاطب ہے۔ وہ ایک ایسے شہر سے مخاطب ہے جو رات کی بانہوں میں سسک رہا ہے۔ جس کے کلب ویران اور وہاں راگ و رنگ کی محفلیں بے آباد ہو چکی ہیں۔ شاعر وہاں کسی معجزے کا منتظر ہے۔ وہ اس سوئے ہوئے ویران شہر کو جگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ نظم میں تجسیم نگاری کا کمال دیکھیے:

ناچ اے رات کی بانہوں میں سسکتے ہوئے شہر
مرتے جاتے ہیں کلب جاز کی تانیں ہوئیں سلب
صبح کی چاپ سے اندھے ہوئے جلتے ہوئے بلب
زہر کی طرح سرنگوں میں چلی ٹیوب کی لہر

مذکورہ نظم میں انحطاط پذیر معاشرے اور زوال آمادہ تہذیب کو ہدف بنایا گیا ہے۔ شہر کی ویرانی اور تباہی در حقیقت فرد کے داخلی آشوب کا بیانیہ بھی ہے۔ اسی نوعیت کی ایک اور نظم "پام کے پیڑ" سے گفتگو میں بھی طنزیہ انداز میں مظاہر فطرت کی تاراجی پر حرص و ہوس کے مارے ہوئے انسان سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

تم کتھئی چھال کے تنگ موزے میں
اک پیر ڈالے
یہ جوتا پہننے کی کوشش میں لنگڑا رہے۔۔۔
دوسری ٹانگ شاید
کسی عالمی جنگ میں اڑ گئی ہے

نظم "سوگ نگر ۱۹۸۳ء" میں ساقی فاروقی نے ایک ایسے شہر کا ذکر کیا ہے جہاں خون پوش راستوں میں سولیاں گڑی ہوئی ہیں۔ جہاں ویرانی اور خوف نے ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ آمرانہ ادوار میں حکومت کی عوام کُش پالیسیوں کی بدولت لوگ گھروں میں مقید ہیں۔ ہر طرف موت کا پہرہ ہے۔ یہ نظم ساقی فاروقی نے تحریک بحالی جمہوریت ایم۔ آر۔ ڈی (Movement for the Restoration of Democracy) کے موضوع پر لکھی ہے۔ اس تحریک نے اس دور میں سیاست اور سیاسی احتجاج کی روایت قائم کی جب آمرانہ حکومت نے ملک میں سیاست کو ختم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ ۱۹۸۳ء کی یہ تحریک رہنماؤں کی نہیں بلکہ سیاسی کارکنوں کی تحریک تھی۔

ساقی فاروقی کی نظموں میں عصری آگہی، صنعتی تمدن کے تضادات اور مشینی دور کی کھوکھلی اقدار یافتہ تہذیب کا نوحہ ملتا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی کے بقول:

> "میں اس شاعری کو جدید سمجھتا ہوں جو ہمارے دور کے احساس جرم، خوف، تنہائی، کیفیت انتشار اور اس ذہنی بے چینی کا کسی نہ کسی نہج سے اظہار کرتی ہو جو جدید صنعتی اور مشینی میکانکی تہذیب کی لائی ہوئی مادی خوش حالی، ذہنی کھوکھلے پن، روحانی دیوالیہ پن اور احساس بے چارگی کا عطیہ ہے۔"(۵)

ساقی فاروقی کی نظموں میں عالمی صارفی معاشرے میں سانس لیتے فرد کی ناآسودگی کو مختلف پہلوؤں سے سامنے لایا گیا ہے۔ نظم نوحہ کے چند مصرعے دیکھیے:

یہ میری آنکھوں میں کیسا صحرا اُبھر رہا ہے
میں بال روموں میں بجھ رہا ہوں، شراب خانوں میں جل رہا ہوں
جو میرے اندر دھڑک رہا تھا وہ مر رہا ہے

نظم "زوال" کے چند مصرعے دیکھیے:

ایک بیرک میں چھپے
آج بیئر پیتے رہے
روح کی اوٹ میں
پرچھائیں کوئی پھرتی رہی
برف ذی روح نباتات پر
فالج کی طرح گرتی رہی

ساقی فاروقی کی وطن سے انسلاکیت پر مبنی نظمیں انقلابی فکر کی حامل ہیں۔ ان نظموں میں اُن کے اندر کا حریت پسند انسان ابھر کر باہر آجاتا ہے۔ نظم "شمشاد کی صلیبیں" مختصر مگر معنوی اعتبار سے دو حصوں پر مبنی نظم ہے۔ مذکورہ نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" کی طرز پر حرمت وطن کی خاطر تاریک شاہراہوں پر جاں کی بازی لگانے والے وطن پرستوں کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ نظم کے پہلے حصے میں کوہساروں کے درختوں، دف بجاتی پتیوں، غزالوں کی بستیوں اور بہار کے گیتوں کا منظر سکھ اور شانتی کی علامت کے طور پر دکھایا ہے۔ پہلے حصے میں شاندار منظر نگاری (Imagery) کی گئی ہے لیکن اس کے بعد نظم میں ایک معنوی موڑ (Abrupt Twist) نظر آتا ہے۔ دوسرے حصے میں خوف اور دہشت کے مناظر دکھا کر انقلابی فکر کی آبیاری کی گئی ہے۔ نظم کے دونوں حصے بالترتیب زندگی اور موت جیسی عظیم حقیقتوں کے شعور کا بیانیہ ہیں۔

نشیب مرگ کی تاریک شاہراہوں پر
انھی درختوں سے لاشیں اتاری جائیں گی
رہیں گے زینت مقتل پر سرو قد شمشاد
اب ان سے صرف صلیبیں اُتاری جائیں گی

ساقی فاروقی نے عورت اور اُس سے متعلقہ مسائل کو خصوصی اعتبار سے موضوع نظم بنایا ہے۔ خاص کر ترقی پذیر معاشرے میں عورت پر ہونے والے مظالم اور استحصالی رویوں کو بے نقاب کرتے ہوئے کئی ایک نظمیں لکھیں ہیں۔ جن میں "حمل سرا"، "سیمیا"، "بانجھ"، "نامحرم"، "تتلی"، "سسٹر ماریا تیریزا" تانیثی شعور کے حوالے سے اہم ہیں۔ "شہناز بانو دختر شہباز حسین" میں اپنے ہی خونی رشتوں کے ہاتھوں عورت کا استحصال دکھایا گیا ہے۔ نظم میں ایک ایسی لڑکی کی روداد بیان کی گئی ہے جو اپنے ہی باپ کی جنسی درندگی کا شکار ہے۔

وہ غصے کی سرخ شال میں
طرح طرح کے اندیشوں میں گھری ہوئی

کسی بھر کتے شعلے کی مانند
لرز رہی تھی
دھیان کے دھندلے بائسکوپ میں
رات کی خونیں تصویریں متحرک تھیں
وہ دزدانہ کمرے میں آئے
بتی اُجال کے۔۔۔

تانیثی شعور کی حامل نظم "حمل سرا" میں شوہر کی عدم توجہی کا شکار ایک عورت (دادی اماں) ساری زندگی کی تنہائی اور بے گانگی کا تریاق طلاق کی صورت میں چاہتی ہیں۔

ایک جنم تک
اندھی، گونگی، بہری بن کے
اپنے ہی گھر میں بے دخل
بے قدری کے "سخی حسن" میں دفن رہیں
آج نئے آفاق مانگتی ہیں
دادی اماں طلاق مانگتی ہیں

ساقی فاروقی کی نظموں میں جہاں فکری بالیدگی نظر آتی ہے وہیں وہ اسلوبیاتی آہنگ میں بھی ممتاز نظر آتے ہیں۔ اُن کی نظموں میں تمثیل اور تجسیم کے تجربات شعری بیانیے کو منفرد رنگ عطا کرتے ہیں۔ ان کے نظموں میں تجسیم کاری کے تجربات دیکھیے:

ایک سسکی ہوا میں بہتی ہے
رات سرگوشیوں میں کہتی ہے
روح کی آگ سے بدن کو بچاؤ
رنگ سے اپنا پیرہن نہ جلاؤ

ایک سنسان دوپہر میں تجسیم کا کامیاب تجربہ دیکھیے:

نئے زخموں سے بدحواس زمیں
اپنی پیاسی زباں نکالے ہوئے
چیختی ہے کہ زندگی کا لہو

ایک نادیدہ آسمانی بلا

چاٹتی جارہی ہے۔۔۔

ساقی فاروقی کی نظم کا وصف یہ ہے کہ وہ انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کو تلاش کرتی ہے۔ ان کی شاعری تڑپ کے احساس سے لبریز ہے جو قارئین کو ایک ایسی دنیا کی طرف کھینچتی ہے جہاں جذباتی وفور جذبات کو بھڑکاتا ہے۔ وہ روایتی شعری اصناف کو عصری حساسیت سے ہم آہنگ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کلاسیکی اُردو شاعروں سے متاثر ہو کر اپنے کام کو جدید موضوعات اور نقطہ نظر سے متاثر کرتے ہوئے وہ ایک منفرد شاعرانہ منظرنامہ تخلیق کرتا ہے۔ ان کی نظمیں موسیقی کی خاصیت رکھتی ہیں اور ذہن کے پردے پر بڑے دیر تک گونجتی رہتی ہیں۔ اپنی فکری اپج کے ذریعے وہ وجودی سوالات سے نمٹتا ہے۔ وجود کی نوعیت شناخت اور بدلتی ہوئی دنیا میں معنی کی تلاش اس کا بنیادی ہدف ہے۔ ساقی فاروقی کی نظمیہ شاعری موجود ادبی منظرنامے میں تنوع اور جدت کی عمدہ مثال ہے۔ اُن کے الفاظ روح کو جھنجھوڑنے اور حواس کو بیدار کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ساقی فاروقی، ساقی فاروقی سے گفتگو (افتخار عارف)، مشمولہ: حاجی بھائی پانی والا اور دوسری نظمیں اور غزلیں، ۲۰۰۱ء، م ن، ص۱۹

۲۔ ن۔م راشد، "غیبت کا شامیانہ"، مشمولہ: رادار از ساقی فاروقی، قوسین، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص۲۱

۳۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصنافِ ادب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص۶۱

۴۔ نوشاد عالم، جدید شہر آشوب، ترتیب و تقدیم، دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص۳۰

۵۔ شمس الرحمن فاروقی، لفظ و معنی، ۲۰۰۹ء، ص۱۲۲